بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

"اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے" یہ نعرہ سب سے پہلے مشنری مصنفین یورپ نے بلند کیا تھا اور مقصد یہ تھا کہ یورپ میں مذہب کی نشاۃِ ثانیہ کے بعد عیسائیت کو اسلام کی طرف سے جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا مسیحیت کو اس سے محفوظ رکھا جائے مشنری مصنفین نے اس کا چرچا اس زور شور سے کیا کہ انگلستان کی ہر مسِ سیمیں بدن کہنے لگی

"یوئے خون آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے"

لیکن آخر جب یورپ میں علم اور سائنس کی روشنی پھیلی اور مذہبی تعصب و تنگ نظری کے بجائے تاریخی حقائق و واقعات کا سنجیدہ شعور و فکر پیدا ہوا تو خود یورپ میں کارلائل ایسے انصاف پسند مصنفین و ادبا پیدا ہوئے جنہوں نے اس بے بنیاد الزام کی تردید کی اور اسلام کے محاسن و فضائل کا برملا اعتراف کیا اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ ڈاکٹر ڈبلیو۔ ٹی۔ آرنلڈ نے تو سالہائے دراز کی محنت و تحقیق کے بعد "دعوت اسلام" (دی پریچنگ آف اسلام) کے نام سے ایک ایسی ضخیم اور محققانہ کتاب لکھی کہ جہاں تک اس خاص الزام کا تعلق ہے اس کتاب نے ہمیشہ کے لئے مخالفین کا منہ بند کر دیا۔ پھر آج یورپ اور امریکہ میں جگہ جگہ اسلامی علوم و فنون، اسلامی دینیات اور اسلامی فلسفۂ حیات اور اسلامی کلچر پر جو لاکھوں روپیہ کے خرچ سے تحقیقات ہو رہی ہیں اور اس مقصد کے لئے بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں جو ادارے قایم ہیں یہ خود اس بات کی دلیل ہیں کہ یورپ اور امریکہ نے اسلام کی ثقافتی اور تہذیبی عظمت کو تسلیم کر لیا ہے ورنہ جو مذہب تلوار کے بل بوتہ پر فروغ پائے وہ ہرگز اس لائق نہیں ہو سکتا کہ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے موجودہ دورِ ترقی میں اس کے ساتھ اعتنا کیا جائے۔

لیکن افسوس ہے کہ اب خود ہندوستان میں بعض کوتاہ نظروں نے پھر اسلام کے خلاف اسی قسم کے اوچھے ہتھیار استعمال کرنے شروع کر دیئے ہیں اور وہی اسلام اور تلوار کا افسانہ دیرینہ شد و مد کے ساتھ دہرایا

جانے لگا ہے۔ حالانکہ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہ حقیقت یہاں کے ہر بام و در سے نمایاں ہے کہ جن مسلمان قوموں نے اس ملک کو فتح کیا۔ اور یہاں اپنی حکومت و سلطنت کا تخت بچھایا انھوں نے خود اس ملک کو اپنا وطن بنا لیا۔ اور آخر وہ اور ان کی اولادیں اسی ملک کی خاک کا پیوند ہو کر رہ گئے۔ ان کو اس ملک کے ساتھ وہی محبت تھی جو انھیں اپنے آبا و اجداد کے جنم بھومیوں کے ساتھ ہو سکتی تھی۔ انھوں نے اس ملک کی دولت سے اپنے وطنوں کو جہاں سے وہ آئے تھے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا بلکہ اس دولت سے اسی ملک کی خدمت کی۔ ملک کے پرانے باشندوں کو اپنا ہم وطن سمجھا اور ان کے ساتھ ان کے علوم و فنون اور کلچر کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو از روئے شرافت و انسانیت اپنے برادرانِ وطن کے ساتھ کرنا چاہیے تھا۔

ان بادشاہوں اور فرمانروایانِ ہند کی طبیعتیں اور مزاج۔ ان کے عادات و اطوار مختلف قسم کے تھے جو ان میں انصاف پسند اور رحم دل تھا وہ ہندو ہوں یا مسلمان سب کے لئے تھا اور جو متشدد اور سخت گیر تھا وہ بلا امتیازِ فرقہ و نسل ہر ایک کے لئے ہی تھا علاوہ بریں زمانۂ جنگ کے اخلاقیات عہدِ امن کے اخلاقیات سے مختلف ہوتے ہیں۔ کسی ایک گروہ نے جنگ کے زمانہ میں اپنے فریقِ محارب کے ساتھ جو کچھ کیا ہو اس کو دلیل بنا کر ہرگز یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس گروہ کے معتقداتِ مذہبی یہی ہیں اور اس کا مذہب اسی قسم کے برتاؤ کا حکم کرتا ہے ایک انسان جب غصہ میں ہوتا ہے تو بسا اوقات وہ خود اپنی زندگی اپنے ہاتوں ختم کر دیتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کا یہ فعل زندگی کے فطری قوانین کے خلاف ہوتا ہے اس کو کوئی شخص اصولِ حیات نہیں کہہ سکتا پھر کسی ایک قوم کے اخلاقی ضابطۂ حیات کا جائزہ لینے کے لئے اس قوم کے چند ایک افراد و اشخاص کے اعمال و افعال کو بہ طور معیار پیش کرنا صحیح نہیں بلکہ ضروری ہے کہ وسعتِ نظر اور دقتِ نگاہ کے ساتھ اس قوم کی پوری تاریخ کو فلسفۂ تاریخ کی روشنی میں جانچا اور پرکھا جائے۔

جہاں تک ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ حکومت کا تعلق ہے یہ بات دعوی کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ حکومت اگرچہ اپنے ابتدائی دور میں ایک غیر ملکی حکومت کی حیثیت رکھتی ہو لیکن جلد ہی اس نے ملکی حکومت

کی شکل اختیار کر لی اور اسی وجہ سے وہ صدیوں تک قایم رہ سکی ورنہ یہ بات اس ملک کے باشندوں کے لئے بڑے ننگ و عار کا باعث ہوگی کہ وہ آٹھ سو سال تک اس حکومت کو ختم نہیں کر سکے اور اتنی طویل مدت انھوں نے اس کی غلامی کے زیر سایہ گذار دی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک دوسرے کے سماجی و معاشرتی رسوم و عادات کا اختیار کر لینا۔ ایک دوسرے کے علوم و فنون سے باخبر ہونا اور ان میں مہارت بہم پہنچانا ایک مشترکہ زبان بولنا۔ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا۔ یہ سب اس امر کی دلیل ہیں کہ ہندو اور مسلمانوں کے باہم اختلاط و امتزاج سے ایک نئی قوم پیدا ہو گئی تھی جو مذہبی اختلاف کے باوجود قومی حیثیت سے صرف ہندوستانی تھی اور اس بنا پر یہاں جو حکومت تھی اس کو غیر ملکی اور اجنبی حکومت نہیں کہا جا سکتا۔"

اگر یہ حکومت غیر ملکی ہوتی تو ایک مرتبہ نہیں بلکہ متعدد بار ہندوؤں کو ایسے مواقع ملے کہ اگر وہ چاہتے تو اس حکومت کو وقت سے بہت پہلے بڑی آسانی سے ختم کر سکتے تھے، اورنگ زیب عالمگیر برسوں تک دکن میں اپنی فوجیں لئے پڑا رہا اور مصروفِ جنگ رہا لیکن یہاں اس کے دار السلطنت میں نہ ہندوؤں نے بغاوت کی اور نہ کوئی شورش پیدا ہوئی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف ہندو اور مسلمان دونوں نے ایک ساتھ جنگ لڑی یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں ملکی وطنیت کے لحاظ سے ایک تھے

آگرہ اور دلی مسلمان بادشاہوں کا دار الحکومت تھی۔ ان کی فوجی طاقت اور حکومت کا رعب و داب جو یہاں ہو سکتا تھا ملک کے دوسرے حصوں میں ہرگز نہیں ہو سکتا تھا" پس اگر اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے تو کوئی بتائے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ بنگال۔ پنجاب۔ سندھ اور سرحد میں عددی اعتبار سے مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ میں ان کی آبادی ۱۴ فی صدی سے متجاوز نہ ہو سکی اور پھر اقتصادی اعتبار سے بھی بحیثیت مجموعی جتنے خوش حال یہاں کے ہندو رہے مسلمان نہیں ہو سکے اگر حکومت کا سہارا صرف تلوار تھی تو بتانا چاہئے کہ یہ کس قسم کی تلوار تھی جو ہندوؤں کو آٹھ سو سال تک غلامی کے شکنجے میں تو کسے رہی لیکن مسلمانوں کو اقلیت سے اکثریت میں تبدیل نہیں کر سکی۔